Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

خطوطِ غالب کے آئینے میں ناول "غالب" کا تجزیاتی مطالعہ

AN ANALYTICAL STUDY OF THE NOVEL "GHALIB" IN THE LIGHT OF GHALIB'S LETTERS

*ڈاکٹر غلام فریدہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

**ڈاکٹر طاہر نواز، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی گلگت بلتستان

The tradition of writing autobiographical novels continues in literature from the very beginning. Novel "Ghalib" is a very important novel by Qazi Abdul Sattar. In this novel, he has tried to describe Ghalib's personality and his domestic, social situation on historical grounds. However, the character of "Ghalib" has been swayed in some places. The reason is that the novelist has created a romantic atmosphere in the novel. In this research paper, personality of Ghalib has been analyzed in the mirror of the novel and his letters.

Keywrods: Ghalib, Novel, Qazi Abdul Sattar, Ghalib's Letters

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو ادب کی تاریخ میں ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر سے اردو ادب کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ انیسویں صدی کو غالب کی صدی کہا جاتا ہے۔ غالب کی شاعری اور نثر کے ساتھ ساتھ ان کی متنوع مزاج شخصیت بھی ناقدین اور محققین کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ غالب انانیت پسند طبیعت کے مالک انسان تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اپنی شخصی وضع داری کے جذبے پر کسی دوسرے جذبے کو غالب نہیں آنے دیا۔ ان کی شخصیت کا ظریفانہ پہلو اس پر مستزاد ہے، یہی وجہ ہے کہ ذاتی زندگی کی ناآسودگیوں ، معاشی تنگدستیوں اور زمانے کی سختیاں سہنے کے باوجود غالب کی رگِ ظرافت کہیں بھی کمزور پڑتی نظر نہیں آتی۔ مرزا غالب کی حیات و شخصیت پر اگرچہ بہت سی سوانحی تحریریں لکھی جا چکی ہیں، تاہم حیاتِ جاوید کو اس ضمن میں اولیت حاصل رہے گی۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت پر سوانحی فلمیں بھی بن چکی ہیں، تاہم قاضی عبد الستار کا ناول "غالب" اس حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں غالب ایک ایسے جولاں طبع ہیرو کے روپ میں سامنے آتے ہیں جو ایک طرف زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو دوسری طرف حالات کی سختیوں کے سامنے خود کو مجبور اور بے بس بھی محسوس کرتا ہے۔ اس مقالے میں غالب کی شخصیت کو اس ناول کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس حوالے سے خطوطِ غالب کو ماخذ بنایا جائے گا۔

سوانح نگاری کا ایک امتیازی وصف سوانحی شخصیت کے کوائف اور اس کی شخصیت کی خاکہ نگاری ہے۔ مرزا غالب اپنی جوانی میں ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ اس بات کا ذکر ان کے اپنے خطوط میں بھی بخوبی ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے"۔[1] اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی شخصی وجاہت کا بخوبی احساس تھا۔ غالب کا تعلق مغل خاندان سے تھا۔ اعلیٰ حسب نسب کی وجہ سے غالب کی شخصیت میں ایک تفاخر کی جھلک موجود تھی۔ اس کا اعتراف ان کے لکھے گئے خطوط میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھئی مغل بچے غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار کے رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغل بچہ" ہوں۔"[2]

ناول "غالب" میں بھی قاضی عبد الستار نے غالب کی شخصیت کا جس طرح سے خاکہ کھینچا ہے اس سے ان کی شخصیت ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک باوقار جوانِ رعنا کی صورت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہاں غالب کی شخصیت زندگی سے بھرپور ایک ایسے نستعلیق ہیرو کی صورت میں سامنے آتی ہے جو مکمل مردانہ وجاہت کا مالک ہے۔

> "دراز قد، گٹھا ہوا بدن، چمپئی رنگ، ایسا کہ چہرے پر جہاں حجام کا استرہ لگتا سبزی سے چمک جاتی۔ شراب سے سینچی ہوئی غلافی آنکھیں کہ نہا کر نکلتا تو لال لال ڈورے تیرنے لگتے۔ گھڑی ناک کے دونوں طرف تک کھینچے ہوئے گھنے سیاہ ابرو، اکبری ہاتھ کہ بیچ کی انگلی گھٹنوں کے ابھار تک پہنچ جاتی۔ سبز مشروع کے پائجامے سے پیر باہر نکلتے تو بڑی بڑی طناز آنکھیں گڑ جاتیں۔"[3]

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

یہی حسن غالب کی شخصیت کی بہت بڑی کمزوری بن کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ ان کی حسن پرستی کے دائرے میں بہت سی حسین چیزیں شمار ہوتی ہیں لیکن عورت کا حسن انھیں بے حد متاثر کرتا ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں کئی حسین عورتوں سے علاقہ رہا لیکن ابتدائے جوانی میں جس پیشہ ور ڈومنی کے عشق میں مبتلا ہوئے اسے وہ کبھی نہ بھلا سکے۔ غالب اپنے خطوط میں ڈومنی کے محبت کے قصے کو کھول کر بیان نہیں کرتے بل کہ کہیں کہیں بہت مختصر ساذکر ڈومنی کے حوالے سے ملتا ہے۔ ایک جگہ اپنے دوست کو لکھتے ہیں۔

"بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغل بچہ "ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔" [4]

غالب کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال کی عمر میں ڈومنی سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے تھے۔ غلام رسول مہر اپنی کتاب "غالب" میں لکھتے ہیں:

"غالب کا ستم پیشہ ڈومنی کے ساتھ بیس بائیس برس کی عمر میں رابطہ پیدا ہوا تھا۔" [5]

ڈومنی کے کوٹھے پر ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔ غالب سے قلبی وابستگی ہونے کی وجہ سے کوٹھے پر آنے والے لوگوں کی تفصیلات غالب کو بتاتی تھی۔ ڈومنی کے اس رویے سے غالب سے اس کی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ غالب ایک اور خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہو گا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں وہ طرح دار آدمی ہیں۔ اور بھائی تمھاری طرح داری کا ذکر میں نے نواب جان (ایک طوائف) سے سنا ہے۔ جس زمانے میں وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی۔" [6]

شومئ قسمت کہ وہ محبت ابھی پنپنے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ اس معشوقہ کا انتقال ہو گیا۔ ناول "غالب" میں اگرچہ غالب کی زندگی کے اس معاشقے کا ذکر تقریباً اسی ترتیب سے بیان ہوا ہے، تاہم وہ معشوقہ کوئی پیشہ ور خاتون یا ڈومنی نہیں بلکہ ایک بہت باوقار خاندان کی چشم و چراغ اور ایک رئیس کی بیوہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ ناول میں کہیں بھی اس محبوبہ کا اصل نام سامنے نہیں آتا بلکہ وہ ترک بیگم کے نام سے پورے ناول پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف ترک بیگم کا حسن مسحور کن ہے اور دوسری طرف غالب کی بیباک طبیعت اس حسن کو زیر کرتی نظر آتی ہے۔

"ترک بیگم آج اپنے حسن کی جنت کے دروازے کھول دیجیے۔ ہم پر اعتماد کیجیے۔ آپ کی عزت اور حرمت کے سب سے بڑے محافظ ہم خود ہیں۔۔۔۔ کاش آپ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کیا ہوتا۔ کاش آپ کی زبان سے یہ جملہ ہم نے سکرات کے عالم میں سنا ہوتا۔" [7]

ناول میں اس عشق کی داستان کو قاضی عبدالستار نے غالب کی جنسی ہوس کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ غالب کی جنس پرستی محبوب کو زیر کر لینے کی خواہش مند ہے۔ اس لیے وہ ترک بیگم کو اپنی محبت کے شیشے میں پوری طرح اتار لیتے ہیں اور اس حوالے سے وہ اپنی انتہائی وفادار ملازمہ کا بھی اعتماد حاصل کرتے ہیں جو ان کی باہمی ملاقاتوں میں معاونت کرتی ہے۔ ناول میں اس عشقیہ سرگزشت کا بیان قاضی عبدالستار نے بڑی بے باکی سے کیا ہے اور کئی مقامات پر تو ان کا قلم بے قابو ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے ناول نگار کے تخیل پر محمول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ اس قدر بے باکی اور بے حجابی کا تصور غالب کے زمانے میں ناممکن نظر آتا ہے۔

غالب کی اس معشوقہ کی وفات کے بعد انھیں کسی سے اتنی گہری وابستگی نہیں ہوئی، تاہم مخلوقاتِ قدرت میں حسن دیکھنے کی جو خواہش ان کی طبیعت میں موجود تھی وہ تمام عمر ساتھ رہی۔ یہ عشق اس زمانے کی واردات ہے جب غالب شادی شدہ تھے اور امراؤ بیگم کو ان کی زندگی میں آئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں غالب کی آسودہ ازدواجی زندگی کے حوالے سے بھی کچھ الجھنیں سامنے آتی ہیں۔ حیات غالب کے حوالے سے جہاں تک ناقدین کی آرا کا تعلق ہے تو بیشتر اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ غالب اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں تھے۔ اس ناآسودگی کا اظہار ان کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی شادی شدہ زندگی کو کبھی "پھانسی کا پھندہ" کبھی "سرنگوں طوطا" کبھی "بیڑی" اور کہیں "زندان" جیسے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری رائے کے مطابق غالب محض تفنن طبع کے طور پر اس قسم کی تراکیب سے اپنی شادی شدہ زندگی کو متعارف کراتے ہیں۔ اس حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی نے یادگار غالب میں غالب کا دفاع ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اپنی جان سے بڑھ کر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔" [8]

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ناول "غالب" کو پڑھتے ہوئے بھی اسی مواخر الذکر رائے کی حمایت میں قاری کی رائے قائم ہوتی ہے۔ناول میں غالب کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے جو رائے قائم ہوتی ہے وہ نہایت آسودہ حال زندگی کی ہے۔دونوں کے درمیان باہمی مطابقت اور ذہنی ہم آہنگی کی فضا قائم نظر آتی ہے۔مرزا غالب روایتی شوہروں کی طرح اپنی بیگم سے چھیڑ چھاڑ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔مثلاً ایک جگہ ناول میں امراؤ بیگم سے اس طرح ہمکلام ہوتے ہیں "کچھ نہیں۔۔۔بس یہ دیکھ رہا تھا کہ اس بچے کی پیدائش نے آپ پر کتنے من روپ انڈیلا ہے"۔[9]

مرزا غالب جس صدی کی پیدائش تھے اس سے بہت آگے کی ذہنی استعداد لے کر پیدا ہوئے تھے۔اسی لیے اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم تو ایک طرف مردوں کی روایتی تعلیم کا بھی رواج بہت کم تھا۔ایسے میں غالب کا عورتوں کی تعلیم کے حق میں دلائل دینا بہت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔وہ عورتوں کی تعلیم کو محض گھر داری تک محدود تصور نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے نزدیک عورتوں کو تمام فنون اور ان کی باریکیوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود غالب کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔غالب کی والدہ کے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت ان کے خط سے ہی ملتا ہے۔آگرہ میں خداداد خاں اور اس کا بیٹا ولی داد خاں ساہوکارہ کرتے تھے۔ان لوگوں سے غالب کی والدہ کو بھی روپیہ منگوانے کی ضرورت پڑتی تھی۔انہی کو غالب نے لکھا تھا کہ "میری والدہ پڑھی لکھی ہیں، جس دستاویز پر ان کے دستخط ثبت نہ ہوں گے، وہ معتبر اور جائز متصور نہ ہوگی۔"[10]

اسی دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے ناول میں "ترک بیگم" سے غالب کے معاملاتِ محبت کو دیکھا جائے تو یہ باہمی موانست محض ترک بیگم کے حسن و جمال سے عبارت نہیں بلکہ غالب جیسا زود فہم ترک بیگم کی ذہانت اور اس کی سلیقہ فہمی کے آگے بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے۔اسی لیے ترک بیگم سے غالب کی گفتگو شاعری اور زبان کے انتہائی نازک امور پر بھی ہوتی ہے۔

> "علم زبان اور بدیع و بیان کے نازک ترین مسائل صرف زبان ہی نہیں حل کرتی۔آنکھ کی حرکت، ابرو کی جنبش اور لہجے کے زیر و بم کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔" [11]

مرزا غالب کا زمانہ مسلمانوں کے دور زوال کا زمانہ ہے۔مسلمان ہر شعبے میں باقی اقوام سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ایسے حالات میں مرزا جیسا دانشور گرد و پیش کے حالات کا بڑا گہرا نباض ہے۔اسے مسلمانوں کے زوال کے اصل اسباب اور محرکات کا بھی بخوبی علم ہے۔اس زمانے کا ایک فکری رویہ انگریزی اور دیگر مغربی علوم سے بیزاری کا رجحان تھا، جس کی وجہ سے مسلمان سائنسی دور کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی دقیانوسیت میں الجھے ہوئے تھے۔ایسے میں غالب جیسا نباض اس منفی رویے کی تردید کرتا نظر آتا ہے۔ناول میں اس فکری رویے کا اظہار برملا ملتا ہے۔

ناول میں اساطیر کے بیان سے بھی کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مہابھارت جسے ہندوستانی ادب میں کلاسیک کی حیثیت حاصل ہے کا ذکر بھی تمثیلی انداز میں جابجا ملتا ہے۔ناول میں مرزا غالب کا کردار مہابھارت کے ہیرو "یدھشٹر" کی طرز پر متعارف ہوتا ہے۔اس لیے اکثر مقامات پر غالب کے شخصی خصائص کو بیان کرنے کے لیے اس تمثیلی قصے کا سہارا لیا گیا ہے۔

> "مہابھارت کے ہیرو اور راجہ یدھشٹر کے بیٹے ارجن کے گرو درونا چاریہ نے جب دیکھا کہ ان کا ایک بھیل شاگرد فن تیر اندازی میں فضیلت رکھتا ہے تو انھوں نے اپنے بھیل شاگرد سے گرو دکھشنا میں اس کا داہنے ہاتھ کا انگوٹھا مانگ لیا۔" [12]

اس زمانے کی معاشرت میں نوابین کی عورتیں اپنے بناؤ سنگھار کا بہت اہتمام کرتی تھیں۔اس لیے جب بھی کہیں آنا جانا ہوتا تو ان خواتین کے حسن دان ان کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ناول میں ترک بیگم کے حسن دان کا ذکر بھی ملتا ہے، تاہم ان کا حسن دان بناؤ سنگھار کے مقصد کے لیے استعمال ہونے کی بجائے الائچی اور چکنی ڈلی رکھنے کے کام آتا ہے۔یہ بھی غالب کے عہد کی معاشرت کا ایک اور نادر پہلو ہے کہ نوابین کی عورتوں کے لیے حسن اور نفاست دونوں معیارات قابلِ ترجیح ہوتے تھے۔چنانچہ یہ عورتیں ظاہری بناؤ سنگھار کے ساتھ ساتھ نفاست پسندی میں بھی مثال تھیں۔

> "بیگم نے کھلی سے ہاتھ دھو کر حسن دان کھولا اور چکنی ڈلی کے ساتھ الائچی پیش کی۔حسن دان میں الائچی؟۔۔۔ہمارے خاندان کی عورتیں حسن دان کے بغیر نہیں چلتیں اور حسن دان بیوہ عورتوں کو زیب نہیں دیتے اور بیوہ عورتیں رسموں کو تبدیل بھی نہیں کر سکتیں اس لیے ہم نے حسن دان میں ڈلی اور الائچی رکھ لی۔"[13]

قاضی عبد الستار نے حیات غالب کو بیان کرتے ہوئے اس بات کا بھی خاص التزام کیا ہے کہ اس دور اور معاشرت کے آداب و خصائص کو مد نظر رکھا جائے۔اس حوالے سے انھوں نے عہدِ غالب کی زبان کے استعمال کا بھی اہتمام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ناول کو پڑھتے ہوئے اگر ایک طرف ہم غالب کی شخصیت کے افسانوی رنگ کو ان کے دور کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے دیکھتے ہیں تو دوسری طرف غالب اور ان سے وابستہ کردار اپنے عہد کی زبان بولتے محسوس ہوتے ہیں۔ناول میں روز مرہ اور محاورہ دونوں دہلوی رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔"لڑائی میں کھیت

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

رہنا"، "سفید چونڈے پر سیاہی""ماتھے سورج ٹھڈی تارہ" جیسے محاورات اور دلی کے روز مرہ "لپ جھپ""ٹھاکہ مار کر ہنسنا""کھال اتار دوں جوتیاں بنوا لیجیے""رات کی چوٹی کمر پر لوٹ رہی تھی""چہکوں پہکوں" وغیرہ کا استعمال کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔"

غالب کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں پنشن کا واقعہ مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی زندگی کا دائرہ کار اسی پنشن کے قصے کے گرد گھومتا ہے۔پنشن کی نصف سے زائد منسوخی نے انھیں ایک طرف سے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تو دوسری طرف یہی پنشن کا معاملہ ان کی شخصیت کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا ہے۔غالب کے خطوط میں پنشن کے قضیے کا احوال بہت تفصیل سے بیان ہوتا رہا ہے۔مثلاً حالات سے تنگ آ کر وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

"حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔" [14]

پنشن کی معطلی کا واقعہ غالب کی زندگی میں اس لیے بھی بہت حاوی نظر آتا ہے کہ بچپن میں والدین کی وفات کے بعد سے اسی پنشن کے سہارے وہ زندگی گزارتے آ رہے تھے۔چچا کی پنشن سے بھی حصہ آتا تھا۔نواب احمد بخش خاں نے غالب کے لیے وظیفہ بھی مقرر کیا ہوا تھا۔ان کی سربراہی کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں رئیس بنے تو غالب کا وظیفہ بند کر دیا تھا۔ان حالات میں غالب کو اپنی خاندانی پنشن کے لیے قانون سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دیکھا اس پنسنِ قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔" [15]

اچانک پنشن کا بند ہو جانا غالب کی زندگی کا بہت برا سانحہ تھا۔اس سانحے سے نہ صرف ان کے گھریلو اخراجات پر ضرب پڑی، بلکہ اس سے غالب کی سخاوت اور ان کی عیش کوشی بھی خطرے میں پڑ گئی۔یہی وجہ ہے وہ اپنی زندگی کے اس دور میں سخت بوکھلاہٹ کا شکار نظر آتے ہیں۔ناول "غالب" میں بھی قاضی عبدالستار نے ان کی شخصیت کی اس دور کی شکست وریخت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اتنی تاریخیں ہو گئیں پنشن نہیں آئی۔نوکر چاکر الگ بلک رہے ہیں۔جنس الگ ختم ہونے والی ہے۔محل سے خبر آئی ہے کہ نواب ابھی دس بیس دن فیروز پور سے نکلنے والے نہیں۔میں تو جانوں آپ اللہ کا نام لے کر سوار ہو جایئے ہاتھ کے ہاتھ وصول کر لیجیے اور آگے کے لئے ایسا انتظام کر لیجیے کہ دلی میں اور وقت پر مل جایا کرے۔" [16]

غالب بے حساب خرچ کرنے والے انسان تھے۔ایسے میں معاشی تنگ دستی نے بری طرح ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔یوسف مرزا کی بیوی کو اس کے میکے بھیجنے کے لیے ایک بار پھر غالب کو قرض کی ضرورت پڑتی ہے۔ہر بار قرض لیتے ہوئے انھیں اپنی پنشن کے رک جانے کا معاملہ زیادہ شدت سے ستاتا ہے۔

"پنسن کا مقدمہ کلکتے میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیشِ نظر، یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اس میں کیا ضرر۔" [17]

اس ساری صورت حال پر دلی کا اجڑنا مستزاد، جس نے ایامِ پیری میں ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔دہلی غالب کے لیے محض ایک بھرا پُرا شہر نہیں تھا بلکہ پر شکوہ عمارتوں سے مزین، مجلسی زندگی کا جیتا جاگتا ثبوت یہ شہر ان کی کل کائنات تھا۔غالب کی تحریروں میں دہلی کی تباہی وبربادی کے بارے میں بڑی مفصل معلومات ملتی ہیں۔وہ جنگِ آزادی کے دوران دہلی میں مقیم تھے اور حالات کے ظلم وستم برداشت کرنے پر مجبور رہے۔اس واقعے میں بہت سے خاندان ختم ہو چکے تھے۔ہر طرف تباہی وبربادی اور خون ہی خون تھا۔اس واقعے کی وجہ سے لوگ اپنے اہل وعیال سے بچھڑ چکے تھے غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جو دم ہے، غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال واطفال جیتا ہوں۔بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔قلم ہاتھ میں لیے پر، جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔" [18]

اس المناک حادثے میں غالب کا عزیز ترین بھائی یوسف مرزا بھی لقمہ اجل بن گیا۔یوسف مرزا غالب کے چھوٹے بھائی تھے۔ابتدائی زندگی میں والد کی المناک موت اور پھر بعد کی ساری زندگی میں معاشی بدحالی اور ملکی حالات کی ناپائیداری نے یوسف مرزا کو مخبوط الحواس کر دیا تھا۔"مرزا تو سخت جان تھے۔ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں اور بچ نکلے لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے ان کا تیس برس کی عمر سے دماغ خراب تھا۔"[19] یوسف مرزا وفات سے قبل اپنا ذہنی توازن بالکل کھو بیٹھے تھے اس لیے انھیں پابندِ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ناول"

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

غالب" میں ان تمام حالات کا ذکر دہلی کی بربادی کے تناظر میں ملتا ہے۔ یہ دور غالب کی پیری کا دور ہے اس لیے جہاں جوانی کا نشہ سرد پڑا اور بیماریوں کا غلبہ شروع ہوا وہیں زندگی کی تلخیوں نے غالب کی زندگی کا دائرہ مزید تنگ کر دیا۔

> "دن آبلے بن کر پھوٹتے رہے اور راتیں انگاروں پر لوٹتی رہیں۔ اب تک اس نے غم کی اڑتی پر چھائیاں دیکھی تھیں۔ اب غم اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس سامنے کھڑا تھا، اس کے شانوں پر سوار ہو چکا تھا، اس کی ہڈیوں میں اتر چکا تھا۔ نہ شطرنج نہ چوسر، نہ داستان نہ غزل، دل کسی چیز میں اٹکنے سے مجبور تھا۔۔۔ آسمان کو اس کے پیروں کے نیچے کی یہ زمین بھی پسند نہ آئی یعنی یوسف مرزا پاگل ہو گئے اور ایسے کہ زنجیر کر دیئے گئے۔" [20]

۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی لڑی گئی۔ اس جنگ میں کمپنی کو فتح حاصل ہوئی۔ دستنبو میں غالب نے اس جنگ کا حال مصلحت کے تحت لکھا ہے۔ انگریزوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے انقلابیوں کو برا بھلا کہا ہے۔ تاہم خطوطِ غالب میں غالب نے حقیقتِ حال بیان کی ہے۔

> "کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روزہ، بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرِ دہند میں اس نام کا تھا۔" [21]

ناول غالب میں بھی جنگِ آزادی کے بعد غالب کی شخصیت کا اضمحلال واضح صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جنگ کے بعد دوست احباب کی دوری نے غالب کو بالکل ناتواں کر دیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے دل کی ایک الگ دنیا آباد کر لی۔ اس دنیا میں ان کی زندگی کا واحد مصرف محض کتابوں کی ورق گردانی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تلخ و ترش تجربات اس دور کی غزلوں کی صورت میں بیان ہوتے نظر آتے ہیں۔

> "کتابیں انگلیوں سے داغدار ہونے لگیں۔ دن بھر ہاتھوں میں کھلی رہتیں رات بھر چھاتی پر پڑی رہتیں۔ اب دنیا کے ہر مسئلے کا اس کے پاس جواب تھا۔ ہر زخم کا ایک علاج تھا۔ غزلیں اس طرح انجام ہونے لگیں جیسے کوئی سرہانے کھڑا بول رہا ہے۔" [22]

ناول "غالب" میں مرزا غالب اپنی قوم کی بدحالی پر بھی شکوہ کناں ہیں۔ جب وہ قومی انتشار کے اسباب و علل پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں اس قوم کا باہم متحد نہ ہونا اور اکائی کی بجائے ٹکڑوں میں بٹ کر رہنا بہت کھٹکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس قوم کے مستقبل سے بہت بیزار نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اظہار غالب کی شخصیت کے آئینے میں مختلف ناقدین ادب نے بھی کیا ہے۔ ناول میں قاضی عبدالستار نے غالب کے کردار کی زبانی اس بات کا اظہار اس انداز سے کیا ہے۔

> "اس کے ایک دھار سے قوم کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے لیکن کس قوم کی جو ہر سو پچاس کوس پر بدل جاتی ہے۔ نہ ایک زبان بولتی ہے، نہ ایک لباس پہنتی ہے، نہ ایک طرح کا کھانا کھاتی ہے۔ رسم و رواج الگ، تیج تیوہار الگ۔" [23]

مجموعی طور پر ناول "غالب" کو ہم سوانحی ناول کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس میں قاضی عبدالستار نے غالب کی سوانح اور شخصیت کو ان کی حقیقی زندگی کے آئینے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدائی زندگی کے حالات، مزاج کی انانیت، پنشن کی پریشانی، سفر کلکتہ اور پھر دورِ پیری میں ان کے طبعی عوارض اور غدر تک کے واقعات مفصل انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ تاہم صنف کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ناول کے قصے میں اگرچہ دلچسپی بڑھانے کے لیے رومانوی فضا کو تخلیق کرنا اس صنف کی بنیادی ضرورت ہے، تاہم مصنف نے بہت سی جگہوں پر غالب کے عاشقانہ مزاج کو مبالغہ آرائی کی حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ ایک عام کہانی بیان کرتے ہوئے تو ایسی مبالغہ آمیزی قابل قبول ہو سکتی ہے لیکن سوانحی ناول لکھتے ہوئے غالب جیسی بلند پایہ ادبی شخصیت کے حوالے سے اس طرح کے من گھڑت واقعات کو بیان کرتے ہوئے احتیاط اور توازن کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس طرح کی تسامحات سے قطع نظر ناول کے زیادہ تر واقعات، پلاٹ کی ترتیب اور ضمنی کرداروں کی تخلیق غالب کے عہد اور ان کی شخصیت اور مزاج کے عکاس ہیں۔

حوالہ جات

1۔ جاوید وشسٹ، غالب کی حیات و شاعری کا جنسی پہلو (مضمون) مشمولہ: غالب نمبر: شمع حیات، ص 51

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

2۔انوار احمد، غالب کے بہتر خطوط(اسلام آباد: قومی مقتدرہ، ۲۰۱۵)، ص ۱۲۴۔
3۔ قاضی عبدالستار، غالب(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1986ء)، ص20
4۔انوار احمد، غالب کے بہتر خطوط(اسلام آباد: قومی مقتدرہ، ۲۰۱۵)، ص ۱۲۴۔
5۔غلام رسول مہر، غالب(نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۵)، ص ۴۸۔
6۔ایضاً، ص ۴۹۔
7۔ قاضی عبدالستار، غالب ، ص30
8۔ایضاً، ص87
9۔ص21
10۔غلام رسول مہر، غالب (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۵)، ص45
11۔ص22
12۔ص22
13۔ص41
14۔خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد چہارم (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۵۰۳۔
15۔خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد دوم (کراچی:: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء)، ص ۵۱۴
16۔ص88
17۔عبادت بریلوی، غالب اور مطالعہ غالب (لاہور: سکینہ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء)، ۶۳۔
18۔اکرام چغتائی، ۱۸۵۷ء(روز نامچے، معاصر تحریریں ،یادداشتیں) (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷) ، ص ۸۰۔
19۔شیخ محمد اکرام، حیات غالب(دہلی: جہانگیر پبلشرز، س ن)، ص157
20۔ص97
21۔خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد دوم (کراچی:: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء)، ص ۵۱۴۔
22۔ص97
23۔ص104